ہے جب دوا کٹھی ہو جائیں گی اس وقت اُٹھاؤں گا)۔

5- جو عورتیں اپنی زندگی میں صرف خوبصورت رہی ہوتی ہیں ان کے لیے تو بڑھاپا موت ہے جی (شمسی) (بیگم صاحبہ)۔

6- جب دوست ایہ کہن لگ جان کہ شاہ جی اج تاں بہت جوان نظر آرے او سمجھو بڑھاپا آ گیا اے اور چھا گیا اے۔

7- میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور سہمناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال اندیشوں نے مینوں مارکٹ کے فنا کر دتا لیکن یہ سارے واقعات میرے پر وارد نہیں ہوئے بس ڈراندے ای رہے۔

"Old Age"

☆ بڈھے ہونا ایک نہایت ای بُری عادت اے جو نسی انسان بڑی عمر ماں پہنچ کے سکھ جاندا اے۔ اگر اوہ مصروف رہے اور مسجد آندا جاندا رہے تاں ایہے بُری عادت پے ای نئیں سکدی۔

☆ ڈاکٹر نے کہا ''اماں! میں تیریاں سب بماریاں سن لیاں ایں۔ میں آپ نوں جوان نئیں بنا سکدا۔'' اماں بولی ''میں کد کہندی ایں جوان بنا دے۔ میں تاں کہندی ایں بڈھا ای بنا دے۔ ایہ راہ ماں کیا پھسا رکھیا اے۔''

☆ دل کی عمر کا اندازہ سفید بالوں سے نہیں لگایا جا سکتا جی۔

☆ واہ جی واہ ایہہ عینک آپ پر بہت ای سوہنی لگدی اے۔ دس سال جوان لگدے او اپنی عمر تے۔ پھر میں یہ نہیں لوں گی۔ کیونکہ جب بھی اُتاروں گی عمر میں دس سال کا اضافہ نظر آیا کرے گا۔

☆ لڑکیوں نے پوچھا ''اماں! آپ اس عمر میں پہنچ کر بھی اتنی خوبصورت نظر آتی ہیں تو آپ کونسا میک اپ استعمال کرتی ہیں۔'' کہنے لگی ''میں ہونٹوں پر سچائی کی سرخی لگاتی ہوں۔ آواز میں دعا کے الفاظ استعمال کرتی ہوں۔ آنکھوں میں ترس کا اور شفقت کا سرمہ ڈالتی ہوں۔ ہاتھوں پر خیرات کا لوشن استعمال کرتی ہوں۔ جسم کے لیے اپنے فکر کے لیے صداقت اور راستی استعمال میں لاتی ہوں اور دل کے لیے محبت کی ٹانک استعمال کرتی ہوں اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔''

☆ دیکھیں جی! اگر کوئی شے بوڑھی ہے یا پرانی ہے یا عمر رسیدہ ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی اس لیے رہی اور رہتی چلی جا رہی ہے۔ پُرانے خاندان ہیں۔ پُرانی رسمیں ہیں۔ پُرانی روائتیں ہیں یہ سب اس لیے زندہ ہیں کہ زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ ان کے تسلسل کے ساتھ قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی یہ گارنٹی والی چیزیں تھیں۔ (ان کے تسلسل کی گارنٹی اس بات کی ضامن ہے کہ کوالٹی اچھی تھی) آپ ایک اعلیٰ پُرانی قدر کو نئی چیزوں کے طوفان میں غرق کر دیں تو نئی چیزوں سے جب زمانہ اچھائیاں اخذ کرے گا تو وہ پُرانی اعلیٰ قدر پھر اُبھر کر ساتھ آ ملے گی۔ پرانی وضع کی مہمان نوازی، پُرانی شرافت، اخلاقی تقاضے، تجارت

میں ایمانداری یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ مر نہیں سکتیں۔ لوٹ لوٹ کر پھر واپس آئیں گی۔

☆☆☆

خاں صاحب اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے لیکن مجھ پر اللہ کی خصوصی رحمت تھی۔ ہر مقام پر ہر جگہ مجھے خصوصی توجہ بڑے وقار سے مفت مل جاتی۔ اس کی نہ میں حقدار تھی نہ میرا کوئی میرٹ ہی تھا۔ بس کچھ اوپر کی رحمت تھی جو توجہ خاص بن کر مجھ پر ہلکی ہلکی پھوار بن کر برستی رہتی۔

یہاں ہی سے میرے اس اعتقاد کی پیری لگی کہ صحت' عزت اور رزق خصوصی طور پر اللہ کی دین ہے اور وہ کو بعض پر ترجیح دیتا ہی چلا آیا ہے۔ اس کے باوجود سعی اور جدوجہد کا حکم بھی ہے کہ انسان اپنی محنت سے ان نعمتوں کو اوپر حلال کرتا رہے۔

جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے چکی تو مجھ پر پروفیسراں کی توجہ نارچ کی طرح پڑنے لگی۔ مجھے کالج میں پروفیسر سعید سے دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان سے دھرمسالے میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ دسویں کا امتحان دینے کے بعد میری والدہ مجھے اکیلی لاہور بھیجنا نہ چاہتی تھیں۔

دھرمسالہ میں لڑکوں کا کالج تھا جہاں میرا بھائی فسٹ ایئر میں داخل تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں ان کے ساتھ کالج میں مخلوط تعلیم کی قباحتوں کے حوالے ہو جاؤں۔ میری والدہ مجھے آگے پڑھانا بھی چاہتی تھیں اور نظروں سے دور بھی نہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے لبرل تعلیم یافتہ والدین کا ایک گروپ بنایا اور ان کی اعانت اور حوصلہ افزائی سے لوئر دھرمسالہ میں بازار سے کچھ ہی اوپر ایک کوٹھی کرائے پر لی اور ایف اے تک کلاسیں شروع کر دیں۔

اس کالج میں صرف ہمارا Batch زیر تعلیم تھا۔ ہمارے گروپ میں وملا گیان سنگھ' مہندر کالسی اور طیبہ ٹکا بڑے گھرانوں کی سادہ سی لڑکیاں تھیں۔

ہمارے کالج سے وہ سڑک گزرتی تھی جو اپر دھرمسالہ کی طرف رواں دواں تھی۔ اپر دھرمسالہ انگریزوں کی گورکھا پلٹن کی چھاؤنی تھی اور یہاں ہی ایک بڑا وی آئی پی قسم کا بازار تھا' جس میں ایک پارسی تاجر ناروجی کی دکان تھی۔ یہاں ٹین کے ڈبوں میں پیک پھل' جیم' چیز' مکھن' Sausages اور وہ سارا الم غلم ملتا تھا جو انگریز سولجر کھانا پسند کرتے تھے۔

گورکھا سپاہیوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ رہ رہ کر ساری شیخیاں اور Tatste اپنا لیے تھے جن کی وجہ سے وہ مقامی لوگوں سے مختلف ہو گئے تھے۔ ترائی کی یہ سڑک کوتوالی بازار کے چوراہے سے بائیں ہاتھ تھی۔ دائیں ہاتھ نکلنے والی سڑک گھنیارا کی طرف جاتی تھی جہاں ایک چھوٹی واٹر فال گھنیارا تھی۔

اس سڑک پر کوتوالی بازار سے کوئی دو سو میٹر دور ''ہمالیہ ٹاکیز'' سینما تھا۔ سینما سڑک سے اتر کر بنایا گیا تھا' لیکن اس کے Bill Board لب سڑک لگتے تھے اور بازار میں بھی عین چوراہے پر بڑا بورڈ نصب ہوتا جس پر لکھا ہوتا ''[illegible]''

اس ''آج شب کو'' ہم نہ جانے کیوں کبھی سمجھ نہ پائے اور اسے ملا کر آج شب کو ہی پڑھتے رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ

آ جستجو کے کیا معنی ہیں اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اس سینما کے مالک دھرمسالے میں ہمارے ہمسائے تھے اور پشاور کے ہندو Settlers تھے۔ اپنی وضع قطع سے یہ بھائیہ گھرانہ پٹھان لگتا تھا۔ ان کے مرد سروں پر پٹھانی پٹکے پہنتے اور لڑکیاں باہر نکلنے پر سروں پر چادریں اوڑھ کر جایا کرتیں۔

وملا گیان سنگھ کا گھر ہمارے یعنی I- ٹمپل روڈ جانے والی سڑک کی بائیں طرف تھا۔ اس سے اوپر گھنا جنگل اور لیڈیز کلب تھا۔ گیان سنگھ بزنس مین تھے۔ اُن کی بسیں دھرمسالہ سے کانگڑہ اور دھرمسالہ سے پٹھان کوٹ کی طرف شیڈول سے چلتی تھیں۔ وملا کا ایک بھائی سندھ میں حرمقابلے میں مارا گیا تھا' لیکن یہ عہد نہ میڈیا کا تھا۔ نہ شیخی کا..... وہ اپنی امارت کا اظہار گفتگو میں نہیں کرتے تھے۔ وملا اور میں نے بی اے تک اکٹھے ہی تعلیم پائی۔

دوسری اہم لڑکی مہندر کالسی تھی۔ وہ کالسی سٹیٹ کی مہارانی کی بھتیجی تھی اور مہارانی بھی وہ ٹھسے دار خاتون جو مردانہ لباس پہنتی تھی۔ برجس چڑھا کر سر پر سولو ہیٹ لے کر وہ بینڈ ماسٹروں جیسی چھڑی بغل میں دبا کر وائسرائے کے دربار میں جایا کرتی اور وائسرائے بہادر اُس کے لیے کھڑا رہتا۔

مہندر کالسی سکول سے کچھ ہی اُوپر ایک خوبصورت سی کوٹھی میں رہتی تھی۔ پیدل کالج آتی اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا کرتی۔ نہ کبھی اُس کے ہونٹوں پر کالسی ریاست کا نام آیا نہ اُس نے اپنی پھوپھی صاحبہ ہی کا کبھی کوئی ذکر کیا۔ وہ عہد Status کو بگھارنے کا نہیں تھا۔ لوگ اپنی خوبیوں کو چھپانے اور عوام کا حصہ بنے رہنے پر مان کرتے تھے۔

تیسری وی آئی پی لڑکی طیبہ عتیق اللہ تھی۔ ان کے والد کی بھی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اگر کبھی آپ کو دھرمسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو یا آپ نے اس کا نقشہ دیکھا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شہر پہاڑی پر آباد تھا۔ ایک سڑک تھی جو لوئر دھرمسالہ سے اَپر دھرمسالہ کی طرف کوتوالی بازار کے چوراہے سے ہو کر جاتی تھی۔

اس شہر سے نشیب کی طرف بہت بڑی وادی تھی جس میں بھیڈی خانہ اور ریاست ٹکا عتیق اللہ تھی۔ طیبہ کا خاندان دھرمسالہ میں ہی قینچی موڑ والی سڑک پر تھا۔ طیبہ کالج بھی پیدل ہی آتی تھی حالانکہ اُن کے گھر میں کار تھی۔

میں نے ان لڑکیوں کا تعارف آپ سے اس لیے کرایا کہ ان کے مخیر والدین کی بدولت میری والدہ نے ایک پرائیویٹ کالج کھولا۔ جس میں فل ٹائم صرف ایک پروفیسر مس متھائی تھی جو کیرالا سٹیٹ سے آئی تھی۔ ان کے علاوہ باقی تمام پروفیسر گورنمنٹ کالج فار بوائز سے چل کر آتے تھے۔

یہاں پر مجھے پروفیسر سرداری لعل سے ریاضیات پڑھنے کا اتفاق ہوا اور حسن اتفاق ملاحظہ کیجیے کہ بعد میں کنیرڈ کالج میں بھی میں اور وملا گیان سنگھ ان سے میتھ پڑھتے رہے۔ مس متھائی بھی ہمیں دوبارہ کنیرڈ میں اکنامکس پڑھاتی رہیں' لیکن پروفیسر سعید سے کنیرڈ میں ساتھ چھوٹ گیا۔

کشمیری النسل خواجہ سعید نے ہمیں ایف اے میں غالب کی چاٹ لگا دی۔ انہوں نے ہمیں پورا دیوان غالب شعر بہ شعر' ترکیب در ترکیب' حرف بہ حرف پڑھایا۔ غالب کے ذومعنی' ابہام سے پُر اور باعثِ بحث شعروں پر وہ عموماً کہا کرتے ''یہ بات یوں ہے اور وہ بات یوں ہے۔ سمجھ نہیں آتی'' یہ جملہ ہماری تفریح کا باعث تھا۔ تب ہمیں علم نہ تھا کہ اصلی تحقیق کی روح سمجھنے والے کا یہی رویہ اُسے زندگی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

"سائنس یوں کہتی ہے۔ مذہب یوں کہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بات یوں ہے اور یہ بات یوں ہے۔"

"ماں باپ یوں کہتے ہیں۔ بیوی یوں کہتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔"

"بہن بھائی یوں کہتے ہیں۔ دوست یوں کہتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی۔"

پروفیسر خواجہ سعید سے دوبارہ گورنمنٹ کالج میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نہ تو کبھی دھرمسالے کا ذکر کیا۔ نہ کسی قسم کی خاص مراعات ہی دیں۔ باقی تمام طالب علموں کی طرح انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ وہ ہر لیکچر میں عام طور پر چوتھی صدی ہجری کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور لاتے اور اُسے بیسویں صدی تک کھینچ کھانچ کر ایک ہی لڑی میں پرو دیتے۔ اُن کے منہ سے ہم نے چوتھی صدی ہجری کا ذکر اتنی مرتبہ سنا کہ لڑکوں نے اُن کا نام ہی "چوتھی صدی ہجری" رکھ دیا۔ جب بھی وہ کلاس میں آتے..... ہولے ہولے "چوتھی صدی ہجری" کی کھسر پھسر سنائی دیتی۔

دوسرے پروفیسر جن کا ذکر میں ذرا پہلے کر چکی ہوں' اثر صاحب تھے۔ اثر صاحب بھی میرے معاملے میں بے حد Protective تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میری اردو کمزور ہے اور اردو ادب کی معلومات ناکافی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ ... پر میرے عیب و ہنر نہفتہ باشد رہیں۔ اُن دنوں میں لیڈی میکلیگن سے ساندہ کلاں میں شفٹ ہو چکی تھی۔ کرشن نگر سے بس لے کر گورنمنٹ کالج آتی۔ ساندہ میں موسیٰ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اب میرے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر ... تھا۔

مجھے اثر صاحب کی ایک خصوصی مہربانی آج تک یاد ہے۔

فِفتھ ایئر کے امتحان تھے۔ جب میں کمرۂ امتحان میں پہنچی تو ممتحن اعلیٰ نے مجھے ہال میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں خاں صاحب اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑے ہوئے' لیکن نہ وہ میری طرف بڑھے نہ ممتحن اعلیٰ ہی کی طرف۔ شاید کسمسا کر رہ گئے۔

میں بھاگی بھاگی کنٹرولر امتحانات کے دفتر میں پہنچی..... وہ اقبال پر انگریزی میں کوئی مقالہ لکھ رہے تھے۔ مجھے دروازے پر دستک دیتے دیکھ کر بولے "کم ان چائلڈ۔"

میں اندر گئی اور لجاجت سے بولی..... "سر میرا پرچہ ہے اور وہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔"

"بٹ چائلڈ! آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے۔ اندر رولز اب کوئی ہال میں داخل نہیں ہو سکتا....."

"میں کیا کرتی سر..... کرشن نگر سے بس نہیں ملی ٹائم پر۔"

"کم ود می..... آؤ۔"

وہ آگے آگے چلے۔ میں مسکین صورت پیچھے پیچھے ہو لی۔ اس وقت اُن کی عمر بمشکل تمام چالیس بیالیس برس ہو گی لیکن وہ مجھے خزاں رسیدہ بوڑھے نظر آئے۔ پھر چائلڈ چائلڈ کہنے والا میرے لیے فادر فگر بن گیا۔ پتہ نہیں انہوں نے ممتحن سے کیا کہا مجھے پرچہ بھی مل گیا۔ سیٹ بھی اور جوابات رقم کرنے والی خالی کاپی بھی۔

عجیب سا اتفاق ہے کہ اپنی نالائقی کے باوجود میں فِفتھ ایئر میں فسٹ آئی اور خاں صاحب سیکنڈ..... پتہ نہیں یہ خاں صاحب کی کرم نوازی تھی کہ پروفیسروں کی مہربانی' لیکن ایک بار پھر مجھے اہلیت نہ ہونے کے باوجود اللہ کی مہربانی سے

عزت مل گئی۔

سعید صاحب اور اثر صاحب کے علاوہ دوسرے پروفیسراں بھی ہمیں زیادہ تر انگریزی میں پڑھاتے تھے اور بڑی اعلیٰ Guidance دیتے تھے۔

پروفیسر آفتاب احمد ہمیں تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ زیادہ تر ایسی انگریزی کتابوں کا ذکر کرتے جن کا نام بھی ہم نے نہ سنا تھا۔ کبھی کبھی کچھ ایسی کتابیں اُن کے پاس ہوتیں جو وہ خاں صاحب کو اُدھار دے دیتے اور ایک طرح سے عمومی رابطے میں خصوصی توجہ کے مرتکب ہوتے۔ پروفیسر صاحب نے بہت بعد میں غالبؔ پر بہت کام کیا اور انگریزی اور اردو دونوں میں معرکے کی کتابیں لکھیں لیکن یہ باتیں بعد کی ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ہمیں عربی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ لیڈی میکلیگن میں بی ٹی کی کلاسوں کو لیکچر دینے آیا کرتے تھے اور میری والدہ سے اُن کی واقفیت تھی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے امی نے ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سے ہی استدعا کی کہ وہ میرا خیال رکھیں۔ جب بھی وہ ہماری کلاس لیتے ایک ہی جملے سے لیکچر کا اجراء کرتے..... ''قدسیہ توجہ دو.....''

جاتے وقت بھی وہ ہمیشہ پوچھتے..... ''قدسیہ کیا تمہیں سمجھ آئی؟''

کبھی کبھی جب وہ دروازے تک ہی پہنچے ہوتے تو کوئی نہ کوئی لڑکا ہولے سے کہتا..... ''قدسیہ توجہ دو۔''

وہ بلیک بورڈ پر عربی حروف لکھتے۔ عربی میں جمع بنانے کے طریقے اور تثنیہ کے لیے خصوصی انداز سمجھاتے..... مجھے شاید ایک حرف بھی پلے نہ پڑتا لیکن ففتھ ایئر میں چھٹیوں کے دوران جب میں کوئٹے گئی تھی جہاں مجھے میری ڈاکٹر خالہ نے پروفیسر محمد صادق سے عربی کی ٹیوشن لگوا دی تھی۔ اتنے بڑے سکالر کی محنت اور توجہ سے میں عربی کی گرائمر کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ محبت ہمیں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے ملی۔

کلاس میں آ کر حکم لگاتے ''اٹھو اشفاق! یہ غزل پڑھو۔''

کبھی کہتے..... ''قمر! اس شعر کی تشریح کرو۔''

''بتاؤ متنازع فیہ کے ہجے کیا ہیں؟''

اس کلاس میں خاں صاحب خوب کھل کھیلتے۔ جان جان کر اٹک اٹک کر شعر کو بے وزن کر کے پڑھتے۔ صوفی صاحب جھڑکیاں دیتے۔ وہ جھڑکیاں سہہ کر منہ بناتے۔ دوبارہ شعر پڑھتے اور زیادہ خرابی بسیار پیدا کرتے اور لعن طعن سہتے۔ کسی اور کی باری بھی ہوتی تو خاں صاحب اُٹھ کر شعر پڑھنے لگ جاتے۔ یہاں ہی سے خاں صاحب اور صوفی صاحب کی چھیڑ چھاڑ سے گزر کر دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔

صوفی صاحب ہمارے ساتھ پانچویں جماعت کے طالب علموں کا سا سلوک کرتے۔ ہم کسی پروفیسر کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے لیکن صوفی صاحب کے آتے ہی فوراً سلیوٹ کرنے کے انداز میں اُٹھ جاتے اور باجماعت سلام کرتے۔ ہمیں کھڑا پا کر وہ وعلیکم السلام وعلیکم السلام کہتے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ پھر دو ایک شعر

ن اشعار کی تقطیع کرتے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

اُن کے منہ سے اشعار کی بندر بانٹ بڑا آسان سا کام لگتا' لیکن گھر آ کر جب شعروں کو طبلے کی تھاپ میں بٹھانے کی کوشش کی جاتی تو شعر کا ستیاناس ہو جاتا۔ صوفی صاحب جانتے تھے کہ کلاس میں ایک ہی گنیا آدمی ہے باقی سارا بھرتی کا مال ہے۔ اُن کا من چاہا شاگرد اشفاق احمد ہی تھا..... عموماً جملہ یوں شروع کرتے.....'' اوئے پٹھانا ٹرن ٹو پیج ففٹی ٹو (52) اور غزل پڑھ۔'' خاں صاحب بڑی مشکل سے انگلی کو تھوک لگا کر صفحہ باون نکالتے اور شعر یوں پڑھتے کہ کوئی جماعت احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے۔

صوفی صاحب سے محبت اور دوستی کا رشتہ بھی ہمیشہ قائم رہا۔ جب خاں صاحب دیال سنگھ کالج میں پروفیسر لگ گئے تو کبھی کبھی صوفی صاحب سے ادبی محفلوں میں مٹھ بھیڑ ہو جاتی۔

صوفی صاحب کہتے.....'' اوئے اشفاق! ملازم ہو گئے ہیں؟''

''جی صوفی صاحب۔''

''تنخواہ ملتی ہے؟''

''ہاں جی۔''

''پھر؟''

''جی..... پھر کیا؟''

صوفی صاحب ویسا ہی جھڑکا لگاتے جیسا ایم اے میں صادر کرتے تھے.....'' اوئے تیری کمائی میں سے میرے لیے پھوٹی کوڑی نہیں۔''

پکا سا منہ بنا کر خاں صاحب کہتے.....'' صوفی صاحب! خرچے ہی پورے نہیں ہوتے۔''

''ہاں تیرے جیسوں کی اپنی ضرورتیں کب پوری ہوتی ہیں۔ اوئے کم عقلو! تم نے تو ماں باپ کی خدمت نہیں کی۔ رب اللہ کا شکریہ بھی قرض حسنہ کی شکل میں ادا نہیں کیا۔ تم کو کیا پتہ استاد کے کیا حق ہیں؟''

''جی..... واقعی۔''

''واقعی کے بچے دفع ہو جاؤ۔''

اور جب خاں صاحب واقعی دفع ہونے لگتے تو صوفی صاحب کہتے.....'' اوئے اشفاق گھر آ جانا..... کلچے اور کشمیری چائے ملے گی..... میرے جیسے نان کلچے کوئی سارے شہر لاہور میں لگا کر تو دکھائے.....''

صوفی صاحب نے کبھی اپنی شاعری کی تعریف نہ چاہی تھی' لیکن کشمیری چائے اور نان کلچے کھا کر جو تالی نہ بجاتا اس سے صوفی صاحب ناراض ہو جاتے۔

جب ایران کلچرل کمپلیکس سے صوفی صاحب وابستہ ہو گئے تو ان کا ایک چھوٹا سا دفتر مال روڈ پر تھا۔ یہاں خاں صاحب باقاعدگی سے جاتے تھے۔ میں بھی شادی کے بعد دو ایک مرتبہ اُن کے ساتھ گئی۔ صوفی صاحب نے بڑی مزیدار

کشمیری چائے کے ساتھ کلچے کھلائے۔

''صوفی صاحب! پلیز مجھے بھی ایسی چائے بنانا سکھا دیجئے.....''

وہ کچھ دیر متامل رہے پھر مرے ہوئے لہجے میں ساری ترکیب سمجھائی۔ پھر مجھ سے اس ترکیب کا اعادہ کرنے کو کہا۔ میں نے اعادہ کر دیا۔

ہنس کر کہنے لگے..... ''زبانی تو ترکیب ٹھیک ہے لیکن عمل کا مرحلہ سوچ سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ کیا تمہارے ہاتھ میں ذائقہ ہے؟''

میں نے اپنے ہاتھوں پر نگاہ ڈالی۔

''ہاں جی ہے..... ہے صوفی صاحب۔'' خاں صاحب نے پُر زور سفارش کی۔

''لو پھر تو بات بن گئی..... ذائقہ اللہ کی دین ہے اشفاق یار۔ کوئی کوئی ساری عمر پکاتا ہے پر لذت پیدا نہیں ہوتی۔ کوئی کوئی دو دن میں ماسٹر شیف بن جاتا ہے۔''

صوفی صاحب نے مجھے خاص پتی بھی مرحمت فرمائی۔ طریقہ بھی دل لگا کر سمجھایا' لیکن کھانا پکانا ایک پریم ریتی ہے۔ کچھ ہاتھوں سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو کھانے پینے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ قہوہ بنانے میں جس محبت کی ضرورت تھی مجھ میں اُس کی کمی تھی۔ نہ میں ویسا رنگ پیدا کر سکی نہ خوشبو۔ یہی حال میرا تب ہوا جب اے حمید نے مجھے قہوے کی خوبصورت پیالیاں' کشمیری قہوہ اور چینی تک دی' لیکن میرا رزلٹ پاس پاس ہی رہا۔

لوگوں کو کھانا کھلا کر خود خوشی حاصل کرنا پریم ریتی کا جزوِ عظیم ہے۔ میں اس کام کو ساری عمر کرتی رہی ہوں لیکن مسرت حاصل کرنا کبھی بھی میری نیت نہ تھی۔ میں تو اس نظریے سے لوگوں کے آگے کھانا پروستی رہی کہ وہ میری تعریف کریں۔ میرے پکے ہوئے کھانے کو سہلائیں۔ خود تعریفی کی یہ خواہش پوری ہوتی رہی..... لوگوں میں میری خدمت کے چرچے رہے.....

لیکن صوفی صاحب اور اے حمید جیسی چائے کبھی نہ بن سکی۔ شاید اسی وجہ سے میں نے کبھی نان کلچے بنانے کی ٹرائی نہ لی۔ زندگی کے آخری دنوں تک خاں صاحب اصرار کرتے رہے کہ گیس کا تنور لے لو۔ کلچہ' نان' خمیری روٹی سب بہ سہولت سے بن جائیں گے' لیکن میں نے اس سکیم پر کبھی آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ میں پریم ریتی کی کمی ہے۔ میرے ہاتھ میں ذائقہ نہیں۔

اب کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس معاملے میں نہ صوفی صاحب کی شاگردی کی نہ خاں صاحب کے کہنے ہی پر گیس کا تنور لگایا۔ میں نے کچھ نیا سیکھنے کا موقع گنوا دیا۔ انسان اسی طرح نئے مواقع کھو کر سوچتا رہ جاتا ہے کہ اس میں کشش پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کی توجہ سہولت سے حاصل کیوں نہیں کر سکتا۔ اصلی پُرکشش انسان تو فعال پانیوں کی طرح شکل بدلتا جاتا ہے۔ کبھی بھنور کبھی لہر..... کبھی گرداب اور کبھی پُرسکون تال۔

ان مہربان پروفیسر حضرات کے علاوہ ڈاکٹر محمد صادق کا ذکر بھی بہت ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجہ کو توازن میں رکھنے والے منظم اعتدال پسند اور بڑے ہی ڈسپلن والے تھے۔ کلاس میں کوئی کاغذ' چھلکا' بورڈ پر کوئی عبارت

...کھڑکی آڑے ترچھے بیٹھے لڑکے سب اُن کو پریشان کر دیتے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے لیکن اُن کی نظریں خشمگیں ہو کر برسانے لگتیں۔ اُن کے لیے لڑکے اور لڑکیاں سب برابر تھے۔ وہ کسی سے رورعایت نہیں برتتے تھے۔

آپ سے میں ذکر کر چکی ہوں کہ مجھے پہلے موسیٰ پھر الو کالج چھوڑنے آیا کرتا تھا۔ پھر وہ کسی بنچ پر بیٹھ کر وقت گزارتا۔ ابھی مرد حضرات اپنی عزت نفس اور شرافت کی پاسبانی لڑکیوں کی طرح کیا کرتے تھے، لیکن اتنی احتیاط کے ...سے چھیڑ چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جب میں گھر جانے کے لیے اوول کے ساتھ ساتھ ڈھلوان کی طرف جانے والی سڑک پر چلتی تو موسیٰ میرے ساتھ سائے کی طرح ہوتا۔ کچھ منچلے پیچھے سے قوالی کرتے...... "سگِ لیلیٰ سگِ لیلیٰ..... کدھر آیا کدھر بھولا......"

موسیٰ یہ تو نہ سمجھتا تھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں اور ان کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ لیلیٰ کون ہے اور سگِ لیلیٰ کس کو پکارا جا رہا ہے، لیکن اپنی چھٹی حس سے وہ اس قدر جان گیا تھا کہ لڑکوں کی ازلی شرارت رنگ لا رہی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

ابھی مرضی کی شادی، گینگ ریپ، بغیر نکاح کے کسی کے ساتھ رہنا، طلاق لیے بغیر دوسری شادی کر لینا..... ایسے تصورات اور ان سے وابستہ آزادی دُور کا خواب تھی، لیکن لڑکے بالے تو ازل سے شوخ ہوا کرتے ہیں۔ غلیل کا نشانہ بنانا، کسی پر پانی کا چھینٹا اچانک مارنا، بلاوجہ کھانسنا، سیٹی بجا کر توجہ لینا یہ تو بند بند سوسائٹی میں بھی رائج تھے۔

اب آپ آزادی کا فقدان کہہ لیجیے یا مشرقی اقدار کی سربلندی۔ ابھی کالجوں میں مخلوط تعلیم کے باوجود طالب علموں میں بڑے فاصلے تھے۔ معصوم چھیڑ چھاڑ، چھپی ہوئی لگاوٹ، تعلق جنس سے پاک تھا۔ محبت اگر ہو جاتی تو وہ ملنے کے ناجائز راستے تلاش نہ کرتی۔ ابھی محبت اور جنس الگ الگ تھیں۔ ابھی ایسی این جی اوز نہ بنی تھیں جو سکولوں میں جنس کی تعلیم پر اصرار کرتیں۔ کالج میں ایسے سوالنامے بھیجتیں جن میں یہ پوچھا گیا تھا کہ بچپن میں کس کس نے آپ کو Abuse کیا؟ کیا قریبی رشتہ دار بھی اُن کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتے تھے..... ابھی ٹاپ سٹار بھی مائیکل جیکسن کی طرح Child abuse کے مقدموں میں ملوث نہ تھے۔ اگر تھے بھی تو میڈیا نے انہیں گھر گھر کی کہانی نہ بنا دیا تھا۔ انٹرنیٹ پر Chat کا تصور دُور کی بات تھی۔ ٹیلیفون ابھی سلف فون کے دور میں شامل نہ تھا۔ ابھی باتوں کے دوران ٹیپ ریکارڈر پر گفتگو کو ریکارڈ کرنے اور بعدازاں اسے بلیک میل کرنے کی سہولت موجود نہ تھی۔ فون کے دوران تصویر بھی کھینچی جا سکتی ہے۔ اس کی ٹیکنالوجی انسان کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ سائنس کی برکات ابھی اسلحے کی جدید تخریب کاری سے ناآشنا تھیں۔ ایسی رنگ برنگی ایجادات سے زندگی میں نیرنگی، رنگا رنگی اور تجرباتی عیاشی کی رفتار ہلکی تھی۔ ابھی آزادی کا تصور کم اور حیا میں لپٹی خوشی کا حصول زیادہ اہم تھا۔

اس روز ڈاکٹر صاحب کا لیکچر لمبا ہو گیا تھا۔ پرنسپل صاحب کے دفتر سے کچھ دُور ڈھلوان کی طرف لڑکوں کی ٹولی جنگلوں پر طبلہ بجا کر قوالی کی پریکٹس کر رہے تھے۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کی طوالت وجہ بنی کہ لڑکوں کی قوالی نے موسیٰ کو گھبرا دیا۔ وہ گھبرایا ہوا ہمارے کمرے تک پہنچا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ موسیٰ نے آج تک ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج جانتے ہوئے میں کچھ گھبرا گئی۔

اس وقت خاں صاحب کھانستے ہوئے باہر چلے گئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہوں نے باہر جا کر موسیٰ کو سمجھایا ہوگا کیونکہ جب میں باہر نکلی تو موسیٰ نے ہلکا سا کھانس کر کہا..... ''وہ بی بی جی! آپ کی کلاس کا لڑکا آیا تھا۔ بولتا تھا کہ میں اندر نہ جاؤں.....''

اس سے زیادہ موسیٰ اور مجھ میں گفتگو نہ ہوئی۔

لیکن پروفیسر محمد صادق کے ساتھ کچھ دیر بعد ایک اور پھڈا ہو گیا۔

میرے بڑے بھائی ریزی بھی کالج میں داخل تھے اور ایف ایس سی کر رہے تھے۔ ہم ان دنوں لیڈی میکلیگن چھوڑ کر ساندہ کلاں میں جا بسے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریزی شکاری آدمی تھا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا ترنگ سمائی۔ اپنی ڈیزی گن اُٹھا کر گورنمنٹ کالج پہنچا۔

گورنمنٹ کالج کے اُونچے مینارے پر کبوتر رہا کرتے تھے۔ اتوار کے دن کالج قریباً سنسان تھا۔ ریزی نے دو تین کبوتر گن فائر کر کے مار گرائے۔ اتنے میں کہیں سے ڈاکٹر محمد صادق آ گئے۔ انہوں نے ریزی سے گن چھین لی۔

دوسرے دن کلاس میں پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا..... ''پرویز چٹھہ تمہارا بھائی ہے.....؟''

''جی سر.....''

''وہ اتوار کے روز کالج میں کیا کر رہا تھا۔ وہ بھی سائنس سٹوڈنٹ۔''

مجھے علم نہ تھا کہ ریزی اتوار کے روز بھی کالج آیا تھا۔

''اُس نے کالج کے Rules violate کیے ہیں۔ کوئی لڑکا کالج کے کبوتر مار نہیں سکتا اور تمہارے بھائی نے پورے تین کبوتر مار دیئے۔''

میں حیران اُن کا چہرہ دیکھنے لگی۔ خاں صاحب اُٹھ کر کھڑے ہو گئے..... جیسے وہ مارنے مرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔

''سر.....'' آہستہ سے خاں صاحب نے کہا ''سر! قدسیہ کا بھائی شکاری ہے۔ یہ لوگ پہاڑوں کے رہنے والے ہیں۔ یہ اپنے گورکھا استاد کے ساتھ شکار کیا کرتا تھا۔ سر! ریزی نے ایک بار سیرغ بھی مارا تھا۔''

نہ جانے انہیں یہ سب کیسے معلوم تھا۔

پروفیسر محمد صادق کو اور بھی غصہ چڑھ گیا۔

''شکاری ہوگا اپنے گھر۔ رولز آر رولز۔''

''پہلی بار تو معافی ملنی چاہیے۔'' اشفاق صاحب نے لجاجت سے کہا۔

''نو..... There is no first time ہر بار Last time ہوتا ہے۔ قدسیہ..... کل سے اپنے بھائی کو کالج نہ بھیجنا۔ اس کا نام Strike off کر دیا ہے.....''

خاں صاحب چپکے سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ اُن کے لیے بے عزتی کا یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔

مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ نیلی لکیروں والی سفید قمیض پہننے والا میرا گارڈین اینجل ہے..... وہ کیسے

[illegible] چاہتا تھا؟ اُس نے لالو سے کیا کچھ پوچھ رکھا تھا.....وہ کون تھا؟ کیا تھا؟.....کیا چاہتا تھا؟ اور کیا چاہنے سے گریز [illegible] یہ بہت سے سوال مجھے سمجھ میں نہ آئے۔ اتنی بات ضرور پتہ چل گئی کہ اُس کی نیت نیک ہے اور وہ مجھے کسی مشکل [illegible] پریشان ہو جاتا ہے.....

گھر واپسی پر زینب کے پاس باورچی خانے میں بیٹھ کر جب میں روٹی کھا رہی تھی تو لالو نے کہا....''صوفی [illegible] وہ جو گورے صاحب آپ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا دروازے سے کبھی مت جھانکا کرو.....جب [illegible] میں خود تمہیں بتا جاؤں گا۔ تم برآمدے میں نہ آنا۔''

''صوفی صاحب کس کی بات کرتا ہے لالو؟''

''مجھے کیا پتہ کون کون ہے اب تو ففتھ ایئر بھی آ گئی ہے.....کیا پتہ چلتا ہے کون کہاں سے آیا ہے۔ رنگ [illegible] بولی.....رنگ رنگ کے لوگ۔''

''یہ تو ٹھیک ہے صوفی صاحب۔''

پتہ نہیں کیوں زینب نہ مجھے آپا جی کہتی تھی نہ باجی.....بس اُس نے اپنے سے میرا نام صوفی صاحب رکھ چھوڑا [illegible] نے ریزی سے کبوتروں والی بات بھی نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا دل ڈاکٹر محمد صادق کی بات سن کر پریشان [illegible] ویسے بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے' لیکن کم آمیز اور کم گو رابطے میں ہر بات Share کرنے [illegible] عادت نہ تھی۔

اُن دنوں جب میں گورنمنٹ کالج میں اپنا مقام تلاش کرنے میں مگن تھی اور لیڈی میکلیگن کالج سے موی کے [illegible] کر کالج پہنچتی تھی۔ خاں صاحب اپنے کنبے سمیت 1-مزنگ روڈ میں رہتے تھے۔ موج دریا کے سامنے اور ٹمپل روڈ [illegible] میں یہ رہائش گاہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ گھر کا ماتھا کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے پہلو سے سیڑھیاں اُوپر تیسری [illegible] کو جاتی تھیں جہاں خاں صاحب کا بسیرا تھا۔

سیمنٹ کی پکی دیوار بائیں طرف اُس چھوٹے سے مستطیل آنگن کے سامنے تھی جس میں اماں جی کا کھلا [illegible] خانہ تھا۔ ہولے ہولے اس کھلے باورچی خانے کو چھت اور دیواریں نصیب ہو گئیں۔ اماں جی یہاں فراخ دلی سے [illegible] روٹیاں' کھلے شوربے پکاتی رہیں۔ جب وہ بیمار پڑ گئیں تو بی بی خیر جان جنہیں سب بی بی (نخے جان) کہتے تھے [illegible] سنبھال کر گھریلو نظام کی سپر مینیجر بن گئیں۔

باورچی خانے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اُس کے پیچھے بابا جی محمد خاں کا کمرہ اور اُس کے بائیں طرف اماں جی کا عوامی ڈرائنگ روم اور بائیں طرف ایک ڈرائنگ روم قسم کا لمبا کمرہ تھا' جس میں کچھ دیر کے لیے اشفاق [illegible] کیہ جی رہے اور باقی وقت یہ لمبا کمرہ اقبال بھائی کی تحویل میں رہا۔

دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا' جس میں بارشوں کے علاوہ بہت کم گوندھنا ریندھنا ہوتا [illegible] جی کو کچن گارڈن کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے انہوں نے کھلے باورچی خانے کے ساتھ جامن کا درخت' دو ایک [illegible] کے قد آور پودے' کیاری میں دھنیا' پودینہ اُگا رکھا تھا۔ پٹھان لوگ بنیادی طور پر کاشتکار ہوتے ہیں۔ ان کی رگ

پنجاب کے کاشتکاروں سے ملتی جلتی ہے۔ تھوڑی سی جگہ دیکھ کر کچھ نہ کچھ بوڈا لنے پراُکساتی رہتی ہے۔

دوسری منزل پر باہر والی سیڑھیاں بھی جاتی تھیں اور اندر سے بھی اُوپر راستہ جاتا تھا۔ یہاں اقبال احمد خاں اپنی زوجہ باجی ضیاء کے ساتھ رہتے۔ ان کے بچے فاروق' نیلو' وردا بھی چھوٹے تھے۔

تیسری منزل پر صرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا آنگن تھا۔ یہاں خاں صاحب بسیرا کرتے تھے۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ وہ فرش پر سوتے۔ کمرے میں جابجا کتابوں کے ڈھیر اور سگریٹوں کے ٹوٹے۔ پیالیوں میں کافی اور چائے کا پس ماندہ پڑا رہتا۔ یہاں نہ کوئی صفائی والا چڑھتا نہ کوئی ملازم ہی آ کر خبر لیتا۔

اپنے چھوٹے سے سٹوو پر خود ہی چائے کافی بناتے۔ کھانے کی طلب ہوتی تو نیچے اماں جی کے پاس جا کر کھا لیتے۔ اماں جی اپنے اس درویش صفت بیٹے کے لیے پریشان رہتی تھیں' لیکن یہ بند بند لوگ تھے۔

اظہار محبت ان کے ضابطہ حیات میں موجود نہ تھا۔

تیسری منزل پر کمرے سے نکل کر ایک چھوٹا سا آنگن تھا' جس میں ایک مٹی کے مٹکے کو خاں صاحب نے حمام صورت بنا لیا تھا۔ پیتل کی ٹونٹی مٹکے میں فٹ کی تھی اور اسی کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر باسی برتنوں کو اشنان کرا کے خود کفیل رہنے کا فن خاں صاحب نے سیکھ لیا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ میں کبھی خاں صاحب کے کمرے تک نہ پہنچ پائی۔ میرے لیے 1- مزنگ روڈ جادو نگری تھی۔ یہاں ایک ایسا خاندان آباد تھا' جس کے رسم و رواج' اقدار' کلچر مقامی لوگوں سے مختلف تھے۔ وہ کسی کھڑکی' درز' ادھ کھلے دروازے سے جھانکنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

مہمند لوگ کھیتی باڑی کرتے آئے تھے۔ یہاں آ کر بھی ان ہجرت کرنے والوں نے مٹی کی دیواریں بنانا' تازہ پر لکڑیاں بیچنا یا پھر کسی زمین کے ٹکڑے پر آبادکاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ عزت نفس ہجرت کرنے والوں کا بنیادی مسئلہ ہوا کرتا تھا۔

جب بھی کوئی وطن چھوڑ کر کسی نئی بستی میں آباد ہو جاتا ہے تو ہر وقت اُسے یہی خوف گھیرے رکھتا ہے کہ کہیں مقامی لوگ اُسے کمتر نہ سمجھ بیٹھیں۔ اپنے میں جذب کرنے کی کوشش نہ کرنے لگ جائیں۔ ہجرت کرنے والوں کو اپنے رسم و رواج کی پاسبانی کرنا پڑتی ہے۔ اپنے آگے ڈھال لے کر چلنے کے عمل میں اُن کی سوشل لائف سکڑتی جاتی ہے اور ان کے اردگرد حصاری دیواریں اونچی ہوتی جاتی ہیں۔

اسی لیے اظہار کے معاملے میں ہجرتی پٹھان گونگا ہو جاتا ہے۔ منیر نیازی ہمیشہ دیر کر دیتا ہے۔ اشفاق احمد چپ رہتے رہتے صوفی راستوں پر پڑ جاتا ہے۔ احمد فراز شاعری میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ خاں صاحب کو شادی کے فیصلے پر پہنچنے میں پورے سات سال لگے۔ اگر ممتاز مفتی' محمد حسین اُن کے پاس 1- مزنگ روڈ نہ آتے جاتے..... ڈیڈی جی اُن کا جیک نہ بنتے تو شاید خاں صاحب یہ قدم کبھی اُٹھا ہی نہ سکتے! وہ کبھی کالج میں مجھے روک کر نہ پوچھ سکتے کہ ''قدسیہ! تم مجھ سے سرگراں کیوں ہو؟''

اُدھر مجھ سی سبک سر سے بھی کوئی فیصلہ نہ پڑتا تھا۔ میری والدہ نے مجھے مخلوط تعلیم کے حوالے کر تو دیا تھا لیکن

مجھے یہ نصیحت کرتی رہتی تھیں...... '' کاکی! تم ایک بیوہ کی بیٹی ہو۔ تمہارے سر پر کوئی باپ نہیں جو تمہاری عزت کا تحفظ کرے۔ پھر تمہارے بھائی کا مسئلہ ہے۔ وہ انجینئرنگ نہیں کر سکا۔ بی اے بھی ابھی فقط خواب ہے۔ تمہارا ایک غلط قدم تمہیں ساری زندگی کے لیے پٹڑی سے اُتار دے گا۔''

غلط قدم اُٹھانا تو دُور کی کوڑی لانا تھا۔ میں تو سیدھے سبھاؤ کسی سے بات کرنے کی بھی اہل نہ تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی اندھے کنوئیں میں اپنی اپنی موٹر سائیکل چلاتے رہتے۔ موت کے کنوئیں سے باہر نکلنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ لفظوں میں اعتراف کرنے، قبول کرنے یا پھر کچھ کر گزرنے کی ہمت نہ تھی۔

مجھے یہ وثوق سے علم نہ تھا کہ اشفاق صاحب مجھے پسند کرتے ہیں۔ وہ بھی غالباً میرے متعلق وثوق کی حد تک نہ پہنچے تھے۔ دن میں کالج آنا جانا، پڑھنا پروفیسروں کی توجہ میں مگن رہنا جاری رہتا۔ شام کو میکلیگن کالج کی پروفیسروں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتی۔ کالج کے سامنے یونیورسٹی کے سوئمنگ پول پر چلی جاتی۔ میری والدہ بڑی ڈسپلن کی عادی تھیں۔ وہ میرے اس میل جول سے خوش تو نہ تھیں لیکن چپ رہتیں کہ زیادہ روک ٹوک سے کہیں بیٹی کی زبان نہ کھل جائے۔

اُن کی پتہ نہیں خدا نے کیسے سنی کہ محترمہ فاطمہ جناح کالج کی وزٹ پر آئیں۔ امی کے کام کو سراہا اور پھر انہیں حکم دیا کہ دیانتدار لوگوں کو کسی ایک ادارے میں جکڑ بند نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان میں ہیومن Resources کی کمی ہے۔ نیا ملک ہے ہر جگہ بہتر افسروں کی کمی ہے اس لیے اگر آپ کی تبدیلی کی جائے تو آپ انکار نہ کیجیے.....

امی کی تبدیلی شیخوپورہ میں انسپکٹرآف سکولز کے عہدے پر ہوگئی۔ میں اور میرا بھائی دونوں اُن کے ساتھ شیخوپورہ گئے لیکن ہم دونوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ میرا بھائی ابھی ایف اے کلیئر نہ کر سکا تھا۔ میں ایم اے کے فائنل میں تھی۔

ریزی بہت ذہین اور فطین تھا لیکن استقامت سے عاری..... وہ مکمل آرٹسٹ تھا۔ نہ تو دُور اندیش تھا نہ مالی منفعت ہی کی اُسے سمجھ آتی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر حیرت میں چلا جاتا۔ اُسے خوش کرنے یا خوش ہونے کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ کی ٹرافی درکار نہ تھی۔ بس زندگی ہی اُس کے لیے بڑی Excitement کا باعث تھی۔

اسی ریزی نے بڑی محبت کے ساتھ 1980ء میں میرے ناول ''راجہ گدھ'' کا سرورق بنایا۔ جس طرح ڈاکٹر عارف بن افتخار نے خاں صاحب کی اور میری وہ تصویر کھینچی جو ہماری قریباً ہر کتاب کے پیچھے پرنٹ کی ہوئی ہے۔ ریزی نے اردو سائنس بورڈ کی ان گنت کتابوں کے سرورق بنائے۔ سبھی گھر رسالے کا آرٹ ڈائریکٹر رہا۔ امریکہ گیا۔ وہاں اپنے آرٹ کی نمائشیں کیں اور بغیر کسی دقت اور پریشانی کے آکر من آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگا۔

ریزی میں ایک بےقرار آرٹسٹ کی روح تھی۔ ایک شکاری، سائنس کے معجزات سے مسحور، پہاڑوں کو تسخیر کرنے والا، ستاروں پر زمزمے بجانے والا۔ وہ ان گنت سمتوں میں سفر کر کے ہنسی خوشی لوٹ آنے والا آرٹسٹ ہے۔

ابھی ہم لیڈی میکلیگن میں ہی تھے کہ ایک روز ریزی یونیورسٹی کلرز لے کر گھر آیا۔

''یہ کیسی ٹرافی ہے.....'' امی نے پوچھا۔

''میں سائیکل ریس میں سیکنڈ آیا ہوں۔''

اس ٹروفی پر امی خوش ہونے کے بجائے اُلٹا ریزی پر برس پڑیں..... ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اجازت کیوں نہ لی؟“

ابھی آپ اتھارٹی سے پوچھے بغیر خدا کو بھی تلاش نہ کر سکتے تھے۔

جب میری والدہ شیخوپورہ چلی گئیں تو ہم کو رہائش کی تکلیف کا اندازہ ہوا۔ ہمارا اب پرنسپل لاج پر کوئی حق نہ تھا۔ امی کی یہ خواہش تو پوری ہوئی کہ پروفیسراں سے گٹھ جوڑ ختم ہونے کی صورت نکل آئی‘ لیکن ایک اور مشکل یہ آن پڑی کہ اب گورنمنٹ کالج میں پڑھنے والے بچے کہاں سر چھپائیں۔ کرائے کا مکان اتنا مہنگا بھی نہ ہو کہ امی کرایہ نہ بھر سکیں۔

ایک روز میری والدہ نے مجھے اور ریزی کو سامان باندھنے کا حکم دیا۔

”سانده کلاں میں گھر مل گیا ہے..... تم دونوں وہاں ٹھیک رہو گے۔ تمہارے پاس زینب اور لالو رہیں گے۔ کرشن نگر سے بس گورنمنٹ کالج تک آتی ہے..... کوئی فکر کی بات نہیں۔ میری تبدیلی شیخوپورہ میں انسپکٹرس آف سکولز ہو گئی ہے۔“

انہوں نے کوئی لمبا چوڑا موقع نہیں دیا۔ بس ہمارا سامان سانده کلاں پہنچا دیا۔

سانده کلاں کا یہ گھر ایک گلی میں تھا اور قریباً آخری گھر تھا۔ گورنمنٹ کالج سے بس لے کر میں پہلے کرشن نگر پہنچتی۔ پھر وہاں سے عموماً پیدل ہی سانده کلاں پہنچ جاتی۔

سانده کلاں میں ہمارے گھر کی دو سیڑھیاں چڑھ کر اندر دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ دائیں ہاتھ باورچی خانہ اور دو چھوٹے کمرے زینب اور لالو کی تحویل میں تھے۔ صحن پار کر کے چھوٹا سا برآمدہ اور دو بڑے کمرے تھے..... یہ گھر ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا۔

یہاں ہمارے ساتھ زینب اور لالو کہیں سے آ گئے..... زینب ہمارے ساتھ گورداسپور سے آئی تھی۔ وہاں جب گروہ در گروہ‘ قافلہ در قافلہ بے آسرا لوگ ستائے ہوئے درماندہ پٹن کی طرف جاتے تو ان بے سروسامان لوگوں پر حملے ہو جاتے..... ہندو لوگ خود تو نہ اتیاچاری بنتے تھے نہ اہنسا کا پرچار کبھی چھوڑتے تھے‘ لیکن اُن کا کام سکھوں کو اُبھارنا اور پرانی دشمنی کو ہوا دینا تھا۔

یہاں پھر نیت کا معاملہ تھا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اندر وہ اس نئے ملک کے قیام پر خوش نہ تھے۔ ہمارا گھر گورداسپور میں ترموری پر تھا جو پٹن کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کے بڑے پھاٹک سے ایک لمبی روش گھر تک جاتی تھی۔ پھر ڈیوڑھی کا دروازہ آتا۔ یہ بیٹھک نما ڈیوڑھی اندر صحن میں کھلتی‘ جس کے چاروں طرف اور اُوپر بھی کمرے تھے۔

جب بھی سڑک پر شور و غوغا ہوتا‘ میرے بھائی ریزی بھاگ کر باہر والے پھاٹک تک جاتے اور کبھی کبھی دو تین لوگوں کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرے بھائی پرویز میں دو خوبیاں تھیں۔ ایک تو وہ سو فیصد آرٹسٹ تھا‘ دوسرے نڈر تھا۔ اُسے شاید اپنے نفس سے جہاد کرنا نہیں آتا تھا لیکن ظلم ہوتا دیکھ کر وہ کبھی بیٹھا نہ رہ سکا۔

اُس شام زینب اور لالو پٹن کی طرف جا رہے تھے‘ جب سکھوں کا حملہ ہوا۔ ننگی کرپانیں نیم دھندلکے میں لشک رہی تھیں۔ ”جو بولے سو نہال“ کا نعرہ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ایسے میں ریزی نے زینب اور لالو کو اندر گھسیٹ کر

تالا لگا دیا۔

زینب جیسے کچھ اور بے آسرا بھی اندر بیٹھک میں ڈرے بیٹھے تھے۔ یہاں سے زینب اور لالو ہمارے ساتھ اور لاہور آ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اُن دنوں لوگ اپنوں کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بہہ جاتے تھے۔ پھر تلاش بسیار کے بعد جب زینب کو پٹیالے والے لوگ نہ ملے تو وہ ہمارے پاس سانده میں آ گئی.....ملنا اور بچھڑنا تو زندگی کے کھیل میں شامل ہے لیکن اس میں بھی جو اسرار ہے وہ بھی کُلّی طور پر انسان کو سمجھ میں نہیں آ سکتے۔

زینب پٹیالے میں کسی نمبردار کی بیوی تھی لیکن اب اُسے میرے گھر کی ورکر بننے میں کوئی عار نہ تھا۔

ادھر سانده کلاں میں ہم دونوں مکمل طور پر آزاد تھے اور کسی کو جواب دہ نہ تھے۔ اپنے عمل، کردار اور وقت کے طرح سے ضامن ہم دونوں خوش تھے لیکن خاں صاحب 1۔مزنگ روڈ میں ایک بھرے پُرے خاندان میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی آزادی کی ایک معکوس شکل تیسری منزل کے الگ تھلگ کمرے میں نکال لی تھی۔

خاں صاحب ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھے جہاں سزا میں کھلم کھلا اظہار تھا لیکن جزا کے سلسلے میں منہ بند رکھنے کا سلیقہ جاری تھا۔ شاید اس گھر کے بڑوں کا خیال تھا کہ تعریف و توصیف سے بچے سر چڑھ جاتے ہیں اور پھر وہ آسمان پر تھگلی لگانے چل نکلتے ہیں اور اس طرح فرعون صفت بچوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس زمانے میں بچوں کے تھپیا رڈالنا اُن کی رائے طلب کرنا درست پرورش کے منافی تھا۔

ایسے میں خاں صاحب اظہار کو احساسِ شکست سمجھتے تھے۔ جب انہیں کُلّی یقین تھا کہ محبت کا ہلکا سا اعتراف بھی مکمل شکست پر منتج ہوگا۔ ابھی تو وہ اپنے خاندان کی روایات میں جکڑبند تھے۔ پھر قدسیہ بیگم کی جھڑکی بھی لگ جائے تو اندر کا تضاد انہیں کسی طور جینے نہ دیتا تھا۔ ایسے میں وہ عجیب طرح سے خوفزدہ ہو کر رہ گئے۔

1۔مزنگ روڈ میں مفتی جی، محمد حسین زولی صاحب اور کبھی کبھار شہاب صاحب آتے جاتے رہتے۔ لیکن خاں صاحب رفتہ رفتہ وہ گم سم گونگے بن گئے جو اپنے کنوئیں کے پانیوں میں نہ تو کسی کو جھانکنے دیتا ہے نہ ٹھنڈے پانی کا گھونٹ پینے کی اجازت ہوتی ہے۔

اب یہ داستان گو، ہنسوڑ، ہر لمحہ دل لگی اور چھیڑ چھاڑ کرنے والا مفتی جی کا گونگا بن گیا تھا۔ ایسے میں لبوں پر آنے والی باتوں نے کاغذ قلم کی سرنگ بنائی اور خیالات کی گاڑی اندر ہی اندر چلنے لگی۔ کچھ نوٹ جواب اُن کے کاغذات سے ملے ہیں، آپ کے درشنوں کے لیے حاضر خدمت ہیں۔ ذرا دیکھئے اُن کی قوتِ تخیل نے کیسے حال سے مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے۔

"خوف"

پتہ نہیں ڈر کیا ہے۔ کیوں لگتا ہے۔ کیسے لگتا ہے اور آج مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے رات کو کوئی میرا گلا گھونٹ دے گا۔ میں سمجھوں گا میں مر گیا لیکن میں مروں گا نہیں۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں اور وہ نہ مرے! کیسی خوفناک بات ہے۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں زندہ ہوں اور وہ جی نہ رہا ہو کس قدر کربناک بات ہے! باجی اوپر کے کمرے میں اس لیے نہیں جاتی کہ اُسے ڈر لگتا۔ میں نے اُسے ڈرا رکھا ہے کہ ڈاکٹر آپا کی روح اوپر کے کمروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔

مرے ہوئے ''ڈپی'' کی روح اوپر کے کمروں میں یونہی گھوما کرتی ہے اور وہ آدھی رات کو دبی دبی چیخیں مارا کرتا ہے
لیے باجی کبھی اوپر نہیں جاتی۔ ظفر کہہ رہا تھا کہ دھرمسالے میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ کانگڑہ آوارہ روحوں کا مسکن ہے۔

ایک دن اُس نے ایک کہانی سنائی کہ وہ اپنے کسی دوست کے بھائی کی شادی پر دھرمسالے گیا تھا۔ یہ گرمی
کے دنوں کی بات ہے۔ وہ رات گئے تک ایک کمرے میں بیٹھے تاش کھیلتے رہے اور جب آدھی رات گزر گئی اور انہوں
بسیرا لینے کے لیے اِدھر اُدھر کسی چارپائی کو دیکھا تو تمام چارپائیاں دوسروں کے تصرف میں آ چکی تھیں۔ ظفر کے دوست
نے کہا یہاں سے ایک میل دور گھاٹی کی طرف ایک گاؤں ہے۔ وہاں میرا ایک دہقانی دوست رہتا ہے۔ چلو اُس کے پا
چل کر رات بسر کریں۔ سیر بھی ہو جائے گی۔ رات بھی کٹ جائے گی اور تمہیں ایک کردار سے بھی ملائیں گے۔ پ
پہاڑی راستوں پر قدم اُٹھاتے وہ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آدھی راہ کٹ جانے پر ایک فقیر کی جھونپڑی نظر آئی۔ یہ لوگ
جب اس کے قریب سے گزرے تو فقیر نے ظفر کے دوست کا نام لے کر کہا ''شاہ جی جا رہے ہیں؟'' اور شاہ جی نے اثبات
میں جواب دیا۔ فقیر گڑگڑی بجاتے ہوئے ظفر کے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ دیر تک ان کی اس بے معنی گفتگو نے ظفر کو
آہستہ آہستہ چلنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی راہ لگ گیا۔ اگلا موڑ گزرنے پر ظفر نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے گھاس
میں پاؤں چھپائے ایک نہایت جمیل عورت کھڑی ہے۔ اس میں اور ظفر میں کوئی آدھ فرلانگ کی دوری ہوگی۔ ظفر ٹھٹک
گیا۔ اس عورت نے مسکرا کر ظفر کو آنکھ ماری اور یہ دم بخود ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی بھوؤں اور چتونوں سے بڑے
لطیف اشارے کر رہی تھی۔ دفعتہً ظفر کو خیال آیا کہ رات اندھیری ہے اور میں اس عورت سے کافی دور کھڑا ہوں۔ پھر بھلا
اس کے چھوٹے چھوٹے اشارے کیسے نظر آ رہے ہیں۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے کے دامن
سے چمٹے ہوئے پہاڑ اپنا وجود بالکل کھو چکے تھے۔ اس نے پھر اس عورت کو دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی اور اس کی کلائی
سے لے کر کہنیوں تک سنہری بالوں کی لوئیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ظفر نے کہا یہ سوائے چڑیل کے اور کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ
ایسا ہی خوبصورت روپ دھار کر راہگیروں کو قتل کیا کرتی ہے لیکن چڑیل کا تصور آتے ہی اس نے اُس کی چھاتیوں کو بڑے
غور سے دیکھا۔ بچپن میں چڑیلوں سے متعلق دو ہی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں اور
دوسرے یہ کہ انہوں نے اپنے پستانوں کو اُٹھا کر کندھوں پر ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ ظفر کو اس کے پاؤں تو نظر نہیں آئے کیونکہ وہ
گھاس میں کھڑی تھی لیکن اس کا سینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کے پھولوں والی قمیض پہن رکھی تھی اور
اُس کی چھاتیاں انسانوں کی سی تھیں۔

اپنی مسکراہٹوں کو اِدھر اُدھر بکھیر کر وہ عورت آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ ظفر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو
وہ تیزی سے قریب آنے لگی اور جب اس نے بھاگنا چاہا تو وہ اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ سڑک کے کنارے چند بڑے
بڑے پتھر پڑے تھے۔ ظفر اُچک کر ایک پتھر پر چڑھ گیا اور پھر وہاں سے کھسک کر اُس کے ساتھ والے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس
عورت نے پتھروں پر چڑھنے کی کوشش میں؛ جب اپنا پاؤں زمین سے اٹھا کر پتھر پر رکھا تو وہ اُلٹا تھا۔

اُس دن کاکی کہہ رہی تھی کہ ''اشفاق صاحب! رات کو میں کمرے سے پھل لینے گئی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے
اندھیرے کونے میں ہلکی سی سیٹی بجا کر انگلی چٹخائی ہو۔ میں چپ چاپ اسی طرح واپس آ گئی۔ مجھے ڈر تو لگتا ہے جی! پر کوئی

[illegible] چلے تو میں ذرا بھی خوف نہیں کھاتی۔"

اشتیاق خالص فوجی آدمی ہے۔ جسمانی تکلیفوں سے خائف نہیں ہوتا۔ روحانی مصائب اس کا کچھ بگاڑ نہیں [illegible] بھینس والی کوٹھڑی سے اب بھی بہت ڈرتا ہے۔ آپا فرخندہ بچارے کو کس قدر تنگ کیا کرتی تھیں۔ بات بات پر [illegible] کوٹھڑی کی طرف گھسیٹتیں۔

لیکن میرا ڈر تو کچھ عجیب سا ہے۔ میں اس لیے نہیں ڈرتا کہ اوپر کے کمروں میں ڈاکٹر آپا کی روح پھرتی ہے اور [illegible] مارا کرتا ہے۔ مجھے ایسا خیال کم ہی آیا ہے کہ ظفر کی طرح میں بھی کسی خوبصورت عورت سے دوچار ہوں گا اور [illegible] اُلٹا ہوگا اور اگر کسی اندھیرے کمرے میں پھل پڑے ہوں تو چاہے وہاں انجن وسل دینے لگے۔ میں تو سیب اور [illegible] اُٹھا کر ہی آؤں گا۔ اشتیاق کی بھینس؟ فیل ہوگی! مجھے یقین ہے کہ ڈر خارجی حالات سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ [illegible] بات ہے کہ ماحول کی مہیب صورتیں کسی کو بھی ڈرا نہیں سکتیں۔ ڈر تو اندر پیدا ہوتا ہے۔ ڈر تو ایک داخلی کیفیت ہے لیکن [illegible] میں نے اپنے کمرے کی چٹخنی آج پہلی مرتبہ کیوں چڑھائی ہے۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ کیوں بند کیا ہے۔ [illegible] اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ کوئی بھی باہر سے نہیں آئے گا۔

میرے کمرے میں میرے بکس سے میری الماری سے ایک صورت آگے بڑھے گی اور میرا گلا دبا دے گی اور [illegible] گا کہ میں مر گیا اور میں مرا نہیں ہوں گا۔ اب بھی یہ سطور لکھتے ہوئے میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ مجھے معلوم [illegible] میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گا میرے پیچھے کھڑے ہونے والا وجود اسی تیزی سے پھر میرے پیچھے ہو جائے گا۔ شام [illegible] کر غسل خانے میں ہاتھ دھو کر گیلری میں جس ٹوٹی ہوئی کرسی کے پاس سے ہر روز گزر کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگتا [illegible] ٹوٹی ہوئی کرسی اس وقت میرے ذہن پر سوار ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اسی ٹوٹی ہوئی کرسی کے ہاتھوں قتل ہوں گا [illegible] کا نہیں! مجھے اس ٹوٹی ہوئی کرسی پر کبھی کوئی ہیولے نظر نہیں آیا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کرسی کسی کے نیچے ہے [illegible] اس وقت کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا۔ پتہ نہیں یہ کیسا ڈر ہے۔ نہ باجی کا نہ ظفر کا نہ کاکی اور نہ اشتیاق کا..... میرا خیال ہے خوف ایک ایسی خشیخ ہے جس کا تعلق نہ تو انسان کے جسم سے ہے اور نہ روح سے۔ بلکہ اس کا تعلق اس کے مقدر سے ہے۔

خشیخ = جذبات + کیفیات + تاثرات = وجدانیات

خلوص + خوف + کرب + ہیبت + ترس

☆☆☆

اس خوبصورت گونگے آدمی کو معلوم نہ تھا کہ سانده کلاں سے پیدل کرشن نگر آنے والی اور کرشن نگر سے بس لے [illegible] گورنمنٹ کالج کے مقابل ہوسٹل کے آگے بس سٹاپ پر جو لڑکی آتی جاتی ہے اُس کے دماغ میں بھی ایک خناس بھرا ہوا [illegible] اس قدر آزادی پسند ہے کہ کسی کو اپنا راز داں بنا کر اعترافِ شکست نہیں کر سکتی۔

مجھ میں سراندیپ کی سروپ لیکھا جیسا حوصلہ نہ تھا کہ شبک سر بن کر مہاراجہ رام چندر کے چرنوں میں پہنچ کر [illegible] دل ستاتی اور اپنی ناک کٹوا کر لنکا کوٹ لوٹ سکتی۔ اعترافِ شکست بڑے لوگوں کا کام ہے۔ وہ عموماً انا کا بُت

توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ہیرو کے بجائے ویلن بن جاتے ہیں لیکن ایسے بڑے لوگوں کو پرواہ نہیں ہوتی۔

ادھر خاں صاحب اپنی خواہش کے پیچھے سرپٹ بھاگنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی اس خواہش سے گریزاں بھی تھے۔ اس تضاد نے انہیں بیکل کر رکھا تھا۔ وہ خواہش کو چھپانے اور اُس کا پرچم لہرانے سے روکے نہیں جا سکتے تھے۔ ایک طرف وہ پوری طرح Commitment کے آدمی تھے اور ساتھ ہی فرار کی راہیں بھی انہیں کشاں کشاں کھینچتی تھیں۔

یہ اُن کے جبلی جرثوموں میں موجود نقص تھا۔ اس Genetic Coding کو اُن کے تمام گھر والوں میں بآسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ جو بھی اس جبلی تضاد سے رہائی پا سکا اُس نے دنیا میں بڑا نام اور مقام پیدا کیا۔ اس کی مثال خالہ آفتاب (وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی) ڈاکٹر طارق بن افتخار (بڈیوں کے سرجن شکاگو) ڈاکٹر جواد ساجد (ہارٹ سرجن) اور پھر خود اشفاق احمد ہیں لیکن اس تضاد سے نکلنے کے لیے انہیں قریباً سات سال لگے۔

وہ خاندان سے باہر ایک جاٹ لڑکی سے شادی کرنے کے آرزومند تھے اور ساتھ ہی خاندانی شناخت اور روایات کی پاسداری قریبی بہن بھائیوں بھتیجوں کی غیر مشروط محبت انہیں کوئی قدم اُٹھانے نہ دیتی تھی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ بانو قدسیہ انہیں بے وفا ہری چگ سمجھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کے بھی آرزومند تھے کہ گھر والوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے اور وہ اُس اعتماد کو مجروح نہ کر بیٹھیں جو بابا جی اماں جی سردار بیگم اور بہن بھائی اُن پر رکھتے ہیں۔ آری کی یہ کیفیت دن رات اُن پر گزرتی تھی۔ اُوپر جاتی تو بھی کاٹتی' نیچے آتی تو بھی ذبح کرتی۔

اُن کے جانے کے بعد سب رشتہ داروں سے میں نے تصویریں اور خط مانگے۔ اخبار میں اشتہار دیا لیکن کسی نے خاطر خواہ مدد نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب چھپ جانے کے بعد واویلا بعد از مرگ ہوگا' لیکن یہی آج کی تیز رفتار زندگی کا المیہ ہے۔ نہ ہم ماضی کو محفوظ کرنے کے اہل رہے ہیں نہ مستقبل کے لیے کسی مثبت پلان پر استقامت سے عمل پیرا ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔ سب کچھ حال کی افراتفری کی نذر ہو گیا ہے۔

اشفاق صاحب ا۔ مزنگ روڈ سے کالج کبھی اپنی سائیکل پر کبھی پیدل راستہ ناپتے رہے لیکن دونوں طرف اعتراف شکست قسم کی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک روز میں اوول والی سڑک پر آ رہی تھی۔ میرے دماغ میں ''سیب کا درخت'' کہانی گھوم رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو ''پہاڑوں سے اُترتی ہوئی میگن سن۔''

جب میں لڑکوں کے ہوسٹل بمقابل بس سٹاپ کے قریب پہنچی تو مجھے لگا جیسے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو اشفاق صاحب بڑی لجاجت اور بظاہر لاتعلقی سے چلے آ رہے تھے۔ میں سمجھی شاید کچھ کتابیں مستعار دینا ہوں گی۔ میرے ساتھ ہی لالو بھی رُک کر سر کھجانے لگا۔

میں نے بات کا آغاز نہ کیا۔

پاس آ کر وہ بولے ''قدسیہ! ادھر کچہری ہے۔ میرے بڑے بھائی آفتاب کا یہی راستہ ہے۔''

میں سمجھ نہ پائی کہ آفتاب کون ہے اور اُن کا ذکر کیوں کیا جا رہا ہے۔ میرے چہرے پر So what? قسم کا تاثر دیکھ کر وہ بولے۔

"اگر انہوں نے مجھے آپ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی! - مزنگ روڈ میں۔"

"تو آپ مجھ سے بات نہ کریں پلیز۔"

وہ چپ ہو گئے۔ ہم دونوں نے پھر کوئی بات نہ کی۔ راجہ رام چندر نے نہ بردان دیا نہ جے مالا میرے گلے میں ڈالی۔ سروپ نکھا کی ناک ہی کاٹی۔ میں نے پلٹ کر کچھ نہ پوچھا اور بس پر ئی۔ میں نے کھڑکی میں سے نہ دیکھا نہ ہاتھ ہی ہلایا، لیکن میں جانتی ہوں بس سٹاپ خالی ہو جانے کے بعد بھی دیر تک اشفاق احمد وہیں ہے۔ تب تجربہ اہم تھا۔ تجزیہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مجھے سمجھ نہ آئی تھی کہ میرے ہم جماعت کے اندر وہ کون سی باڑھ ہے جسے وہ پھاند نہیں سکتا۔

بہرکیف تبدیلی تو چلی آ رہی تھی۔ تبدیلی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ کچھ لوگ شعوری طور پر کچھ لاشعوری طور پر تبدیلی سے ناآشنا ہوتے ہوئے بھی اپنی معصومیت کے سہارے اس تبدیلی کے آگے سر جھکا کر قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نہ کسی فلسفی کی رہنمائی درکار ہوتی ہے نہ کسی صوفی کی دانش ہی۔ بیشتر لوگ تبدیلی سے دوچار ہوتے ہی بھونچکا جاتے ہیں پھر اُن میں زندگی کے ساتھ نپٹنے (Cope) کی سکت باقی نہیں رہتی۔

کچھ تبدیلیاں موسم کے ساتھ آتی ہیں۔ کچھ عمر بڑھنے کے ساتھ چپکے سے در آتی ہیں۔ گود کا بچہ ہمیشہ گود بالک کھیلنے کودنے کھانے پینے کی عمر نو بالغ کی آرزو بدلتے ہی جنس کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کیفیت بھی ٹھہراؤ کی تلاش میں ایک نئی تبدیلی سے آشنا ہو جاتی ہے اور ہر بالغ 'اپنا گھونسلا' ساتھی اور بچوں کے تصورات میں ہو جاتا ہے۔ جونہی بچوں کی کفالت کی ڈگر ایک ہی ڈگر پر چلتے چلتے عادت سی بن جاتی ہے۔ ایک نئی تبدیلی انسان کے دستک دیتی ہے۔

ہر انسان چالیس کے لگ بھگ پہنچ کر Midlife کے کرائسس (Crisis) اور اس سے جنم لینے والی تبدیلیوں کا ہوتا ہے۔ اس عمر کو پختگی کی عمر کہہ لیجیے لیکن یہی عمر ہے جب عام آدمی بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور عمل میں ناپختگی کا ہوتا ہے۔ تبدیلی کو خاموشی سے قبول نہ کرنے کی وجہ سے کئی بار انسان کا image سوسائٹی میں بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ پے در پے شادیاں، معاشقے، معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے دربدر کی ٹھوکریں، ماں باپ سے ہیجانی تصادم، سے بے توازن رابطہ غرضیکہ اس عہد کی تبدیلی میں زلزلے کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ہندو دھرم نے ان تبدیلیوں کے چار ورن طے کر دیے ہیں۔ بال آشرم..... گرہست شرم..... وان پرست آشرم اور بالآخر سنیاس آشرم.....

آخری تبدیلی عموماً بڑھاپے کے ساتھ آتی ہے۔ جب نہ اشیاء سے لگاؤ رہتا ہے نہ انسانی رشتے ہی بامعنی رہتے ہیں۔ تب اطمینانِ قلب صرف ذکرِ الٰہی سے حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ بھی نصیب کی بات ہے۔

صوفی حضرات ان تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے شناسائی اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے "ماننے" کا درس دیتے ہیں۔ علم ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی بتائی ہوئی حدود کو جانتے ہیں اُن کے لیے ماننا مشکل نہیں ہوتا اور وہ ہمت کے امر کوٹ میں قلعہ بند رہتے ہیں۔ اُن کی عافیت اور راحت کچھ ایسی طاقتوں کے ذمے ہوتی ہے جو کبھی دغا نہیں دیتیں۔ یہاں تھوڑی سی اڑچن لوگ اپنے لیے خود پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی تجویز اور فیصلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں

دنیاوی مشکلات کا حل درکار ہوتا ہے۔ انہیں مادی زندگی میں لاٹری نما حل کی تلاش ہوتی ہے اور ڈیرے پر وہ ان خواہشات کو چھپا کر یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وہ اللہ کی تلاش میں ہو۔

صوفی حضرات اللہ کا راستہ صعوبتیں سہنے' مجاہدے اور ریاضتیں کرنے کا علم جانتے ہیں لیکن اُن کے پاس ایسے نسخے موجود نہیں ہوتے جو لوگوں میں راتوں رات' عزت اور امارت کی خوش کن تبدیلی لے آئے۔ عام خواہش کے آدمی کے لیے ماننے کا حکم دل سے مان نہیں سکتے۔ روزِ قیامت پر فرشتوں اور جنات کے وجود پر نبیوں کے علم پر پورے یقین اور ایقان کے ساتھ چلنے والے کے لیے ماننا کچھ ایسا مشکل نہیں.....

خاں صاحب بھی اندر کے تضادات کا شافی حل ڈھونڈنے کے لیے بالآخر ڈیروں تک جا پہنچے لیکن ابھی وہ وقت دُور تھا۔ ابھی وہ اپنے اندر کے تضادات میں خود گھمن گھیریاں کھا رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے وہ مضمون بھی نہ لکھا تھا جو میں یہاں پیش کر رہی ہوں..... کیونکہ اس مضمون کے بغیر اُن کی گورنمنٹ کالج سے وابستگی مکمل نہیں ہوتی۔

چاند کا سفر

گورنمنٹ کالج کی طرف مراجعت کے کئی راستے ہیں اور سارے راستے اپنے اپنے رخ پر چل کر اس منزل تک پہنچتے ہیں جو ہر راوین کے من کا مندر ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے مشہور شیر شاہی اور جرنیلی سڑک تو برٹرینڈ تحفظ' منفعت اور پاور کی سڑک ہے جس پر ایک جمِ غفیر رواں ہے۔ لیکن کچھ راستے جذباتی وادیوں سے ہو کر بھی اس منزل کی طرف جاتے ہیں..... ہم دونوں کا گورنمنٹ کالج سے بندھن ایک بہت ہی کمزور اور کچے سے دھاگے سے بندھا ہے۔ ایک گمنام اور بے نام پگڈنڈی ہے جو خود رو جھاڑیوں اور کھنگر یلے رستوں سے الجھ الجھ کر بڑی مشکل سے من مندر تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تب تک اٹھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک کہ کوئی وہاں سے اٹھا نہ دے! نکال نہ دے!!

بانو قدسیہ نے اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی بھی ایک درسگاہ نہیں سمجھا۔ نہ کبھی ہم اس کی علمی روایت سے متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے استادوں کے تبحرِ علمی سے مرعوب ہوئے۔ اس کی قدامت' اس کی عمارت اور اس کی شخصی وجاہت بھی ہمیں مسحور نہیں کر سکی۔ اس سے کبھی کچھ لیا نہیں' مانگا نہیں' دیا نہیں' دلوایا نہیں۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے۔ دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درسگاہ نہیں مانتے..... اس میں ''سین'' کے حرف کو وافر سمجھتے ہیں!

جب ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ہم سمن آباد میں رہتے تھے اور اپنے مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے ادا کرتے تھے۔ میں ریڈیو میں ملازم تھا اور بانو پشاور کے لیے درسی کتابیں لکھ کر ساٹھ' ستر روپے مہینہ گھر بیٹھے کما لیتی تھی۔ بچے کے دودھ کا ڈبہ بیالیس روپے میں آتا تھا اور وہ ایک مہینے میں تین ڈبے ختم کر جاتا تھا۔ اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولہا آ گیا تھا اور ہمارا ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔ بانو جب گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ تھی تو اس کو روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو گھر کا سودا لانے کے علم سے ناواقف تھا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے یہ دونوں فن سیکھ لیے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب انیق ڈیڑھ سال کا ہوا تو جون کے مہینے میں سخت بیمار ہو گیا۔ اسے اسہال

[illegible] کی شکایت ہوئی جو دو تین دنوں کے اندر اندر بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ محلے کی بڑی بوڑھیوں کے کئی [illegible] لیکن کسی سے افاقہ نہ ہوا۔ بچے کی حالت تشویش ناک ہوگئی تو ہمیں کسی نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر بروچہ کے پاس [illegible] بڑی سخت گرمی میں سہ پہر کے چار بجے ہم "سالم تانگہ" کرا کر اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر میکلوڈ روڈ لے [illegible]

ڈاکٹر صاحب نے بچے کو الٹا پلٹا کر دیکھا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پپوٹے کھول کر معائنہ کیا اور پھر [illegible] ہو کر بولے "بابا تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے جو اب اس کو ہمارے پاس لایا ہے۔ اس کا میں کیا ٹریٹ منٹ [illegible]" بانو زور زور سے رونے لگی اور جاہل فقیرنیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے منہ سے کوئی [illegible] تھی اور وہ خوف کے مارے روئے جا رہی تھی..... ڈاکٹر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر پانچ چھ دواؤں کے امتزاج [illegible] رنگ کا ایملشن تیار کیا۔ اپنی میز کی دراز سے دس پڑیاں نکال کر دیں اور پھر ایملشن کی ایک خوراک میں ایک [illegible] کر مجھے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گود میں لٹانے کا حکم دیا۔ بڑی بیدردی کے ساتھ انہوں نے اس کے جبڑے میں [illegible] کھول کر اس کا منہ کھولا اور دوائی اس کے منہ میں انڈیل دی۔ بچہ اپنی نحیف آواز میں بڑے کرب کے ساتھ رویا تو [illegible] اسے کندھے سے لگا لیا۔ گود میں لے کر تو میں اسے کھڑا تھا لیکن بانو قدسیہ خوف سے کانپتی ہوئی اسے تھپکے جا رہی [illegible] میں بچے نے منہ بھر کر قے کی۔ گرم اور بدبودار۔ تھوڑی سی میرے کندھے پر گری اور باقی کی ساری فرش پر۔

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا "بابا تم کیسا پیرنٹ ہے بچے کو سنبھالنا نہیں جانتا سارا فرش خراب کر دیا۔ یہ کلینک [illegible] تم لوگ کا گھر نہیں۔" ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سے گھبرا گئے۔ ہمیں ڈاکٹروں کا اور ہسپتالوں کا کوئی تجربہ [illegible] ہماری مالی حالت بھی معمولی سی تھی۔ شکل وصورت سے بھی ہم سہمے سہمے ہی تھے اور بچہ کافی بیمار تھا۔ بانو قدسیہ نے [illegible] دوپٹہ تو سر پر محفوظ رکھا اور باقی کے آدھے دوپٹے سے ڈاکٹر صاحب کا فرش صاف کرنے لگی۔

اس نے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر جھکے ہوئے بدن کا سارا بوجھ اس پر [illegible] تھا۔ وہ روئے بھی جا رہی تھی، شرمندگی سے سر بھی جھکائے جا رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا [illegible] نے نارنجی اور کاسنی پھولوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ سبز رنگ کی شلوار تھی اور پاؤں میں ہوائی سلیپر تھے جس میں [illegible] پرتا کی مارتے ہوئے اتر گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ کچھ اینٹیں نیچے کو ہوگئی تھیں کچھ سیم کی [illegible] اوپر کو ابھر آئی تھیں۔ اس اونچ نیچ کے درمیان دوپٹے سے جگہ صاف کرنا کافی مشکل کام تھا لیکن بانو نے اپنے [illegible] تجربے کے زور پر ساری جگہ اچھی طرح سے صاف کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے چور آنکھ سے اپنے فرش کو اس کی اصل [illegible] میں دیکھ کر کہا "بابا تم کیسا لڑکی لوگ ہے سارا دوپٹہ خراب کر لیا۔ اب اس کو باہر جا کر دھو دو۔ اچھی طرح سے صاف [illegible] اس میں جراثیم چلا گیا ہے۔ بچے کے پاس نہیں لانا یہ کپڑا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب باہر نلکا ہے؟"

کہنے لگے "کیوں نہیں ہے۔ یہ ساتھ باجو میں گھوڑوں کے پانی پینے کا حوض ہے نیں۔ اس میں پانی ہی پانی